باتیں ہو چکیں، نوکروں کو آواز دی۔ طبلے کی جوڑی، ستار، طنبورہ یہ سب سامان منگایا۔ گانے بجانے کا جلسہ ہوا۔

جب ہم دونوں اکیلی تھیں تو وہ رام دئی تھی اور میں امیرن۔ سب لوگوں کے سامنے وہ پھر بیگم صاحب ہو گئیں اور میں امراؤ جان۔ تین چار گھنٹے تک گانا بجانا ہوتا رہا۔ بیگم بھی کسی قدر ستار بجا لیتی تھیں۔ جب میں گا چکتی تھی تو ستار کی وہ کوئی گت چھیڑ دیتی تھیں۔ ایک مغلانی کا گلا بہت اچھا تھا، اس کو گوایا۔ سر شام تک بڑے لطف کی صحبت رہی۔

(6)

ہاں اے نگہ شوق مناسب ہے احتیاط
ایسا نہ ہو کہ بزم میں چرچا کرے کوئی

قریب شام محل میں نواب صاحب کی آمد آمد کا غل ہوا۔ وہ بے تکلفی کی صحبت برہم ہو گئی۔ طبلے کی جوڑی، ستار، طنبورہ، سب چیزیں ہٹا دی گئیں۔ چھپنے والیاں اٹھ اٹھ کے پردے میں جانے لگیں۔ اور سب لوگ اپنے اپنے قرینے سے ہو گئے۔ میں بھی بیگم سے الگ ہٹ کر مقطع بن کے بیٹھ گئی۔ جس دالان میں ہم لوگ بیٹھے تھے، وہاں سے دروازے کا سامنا تھا۔ پردہ پڑا ہوا تھا۔ نواب کے انتظار میں اس پردے کی طرف نگاہیں لگی ہوئی تھیں۔ میں بھی اسی طرف دیکھ رہی تھی۔ اتنے میں کسی خدمت گار نے چلا کر کہا۔ "نواب صاحب تشریف لائے ہیں۔" چند لمحے کے بعد مہری نے پردہ اٹھا کے کہا۔ "بسم اللہ الرحمن الرحیم۔" نواب اندر داخل ہوئے۔

میں (صورت دیکھتے ہی دل میں) وہی تو ہیں (سلطان صاحب) ہے ہے! کس موقع پر سامنا ہوا ہے۔ نواب کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ پہلے تو کچھ جھجکے، پھر بغور میری طرف دیکھتے ہوئے آگے بڑھے۔ میں بھی انہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

میں دیکھتا ہوں جو ان کی طرف تو حیرت سے
مری نگاہ کا وہ اضطراب دیکھتے ہیں

اب نواب دالان کے قریب پہنچ گئے اور میری طرف دیکھتے جاتے تھے کہ۔

بیگم:۔ ادئی نواب، دیکھتے کیا ہو؟ یہ وہی ہیں امراؤ جان جو کان پور.....

اب فرش کے قریب پہنچ گئے۔ سب تعظیم کو اٹھ کھڑے ہوئے۔ نواب مسند پر بیگم کے پہلو میں اک ذرا سرک کے بیٹھ گئے۔

اب شام ہو گئی تھی۔ مہری نے دو کنول سفید روشن کر کے سامنے رکھے۔ بیگم پان بنانے لگیں۔ اس اثنا میں نواب نے آنکھ بچا کے میری طرف دیکھا۔ میں نے کنکھیوں سے انہیں دیکھا۔ اب نہ وہ کچھ کہہ سکتے ہیں، نہ میں بول سکتی ہوں۔ منہ سے بولنے کا تو موقع نہ تھا مگر اس وقت آنکھیں زبان کا کام دے رہی تھیں۔ شکوے شکایت، رمز و کنایت، سب اشاروں میں ہوا۔

نواب:۔ (کسی قدر اجنبیت سے) امراؤ جان صاحب! واقعی ہم تو آپ کے بہت ہی ممنون ہیں۔ واقعی کان پور میں اس شب کو تمہاری وجہ سے ہمارا گھر لٹنے سے بچ گیا۔

میں:۔ یہ آپ کیوں مجھے کانٹوں میں گھسیٹتے ہیں۔ ایک اتفاقی امر تھا۔

نواب:۔ خیر وہ کچھ ہو، وجہ تمہاری تھی۔ خیر اسباب تو وہاں کچھ نہ تھا مگر ایک خیریت ہو گئی۔ تمام ضروری کاغذات کوٹھی میں موجود تھے۔

میں:۔ یہ حضور ان دنوں جنگلے میں عورتوں کو چھوڑ کے کہاں گئے تھے؟

نواب:۔ کیا کہوں، ایسی ہی مجبوری تھی۔ لکھنؤ کی جائیداد بادشاہ نے ضبط کر لی تھی۔ لاٹ صاحب کے پاس کلکتے جانا ضرور تھا۔ ایسی عجلت میں گیا تھا کہ نہ کچھ سامان کیا، نہ لیا، نہ دیا۔ صرف شمشیر خاں اور ایک آدمی اور ساتھ لے کے چلا گیا۔

میں:۔ وہ کوٹھی ایسے جنگل میں ہے کہ جو واردات ہو تعجب ہے۔

نواب:۔ سوائے اس واقعے کے اور کوئی واردات نہیں ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ غدر ہونے کو تھا۔ بدمعاشوں نے سر اٹھایا تھا۔ ملک میں اندھیر مچا ہوا تھا۔

اس کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہوا کیں۔ پھر دسترخوان بچھا۔ سب نے ساتھ مل کے کھانا کھایا۔ جب حقہ پان سے فراغت ہو چکی، نواب نے گانے کی فرمائش کی۔ میں نے یہ غزل شروع کی۔

مرتے مرتے نہ قضا یاد آئی
اسی کافر کی ادا یاد آئی
تم کو الفت نہ وفا یاد آئی
یاد آئی تو جفا یاد آئی

ہجر کی رات گزر ہی جاتی
کیوں تری زلف رسا یاد آئی
تم جدائی میں بہت یاد آئے
موت تم سے بھی سوا یاد آئی
لذت معصیت عشق نہ پوچھ
خلد میں بھی یہ بلا یاد آئی
چارہ گر زہر منگا دے تھوڑا
لے مجھے اپنی دوا یاد آئی

اور شعر یاد نہیں۔ مقطع یہ ہے۔

کیا غزل کوئی کہی ہے ۔۔۔۔۔
آج کیوں باد صبا یاد آئی

(7)

جھولا کن ڈارو رے امریاں

برسات کے دن ہیں۔ پانی جھما جھم برس رہا ہے۔ آموں کی فصل ہے۔ میرے کمرے میں مجمع ہے۔ بسم اللہ جان، امیر جان، بیگا جان، خورشید جان، رنڈیوں میں۔ نواب ببن صاحب، نواب چھٹن صاحب، گوہر مرزا، عاشق حسین، تفضل حسین، امجد علی، اکبر علی خاں، مردوں میں۔ یہ سب صاحب موجود ہیں، گانا ہو رہا ہے۔ اتنے میں۔

بسم اللہ جان:۔ بھئی ہو گا۔ گانا تو روز ہوا کرتا ہے۔ اس وقت تو کڑھائی چڑھاؤ۔ کچھ پکوان پکواؤ۔ دیکھو کیسا مینہ برس رہا ہے۔

میں:۔ اونہہ۔ بازار سے جو جی چاہے منگوالو۔

خورشید:۔ بازار سے منگوالو، خوب کہی۔ اپنے ہاتھ سے پکانے میں مزا ہی اور ہے۔

امیر:۔ بہن! تمہیں ہنڈیا پھونکنے کا مزا ہے۔ ہم نے نہ تو کبھی پکایا ہے، نہ پکانے کی قدر

جانتے ہیں۔

بیگا:۔ تو پھر وہی بازار کی ٹھہری۔

میں:۔ اے ہے باجی کیا بھوکی ہو؟

بیگا:۔ میں تو بھوکی نہیں ہوں۔ بسم اللہ سے پوچھو جس نے صلاح دی تھی۔

بسم اللہ:۔ بھئی کچھ نہ کچھ تو آج ہونا چاہیئے۔

میں:۔ میں بتاؤں! چلو بخشی تالاب چلیں۔

بسم اللہ:۔ ہاں بھئی کیا بات کہی ہے۔

خورشید:۔ خوب سیر ہو گی۔

بیگا:۔ ہم بھی چلیں گے۔

میں:۔ اچھا تو سامان کرو۔

بات کرتے تین گاڑیاں کرایہ پر آگئیں۔ کھانے پکانے کا سامان گاڑیوں پر لدوا دیا گیا۔ دو چھولداریاں نواب ببن صاحب کے گھر سے آگئیں۔ سب گاڑیوں پر سوار ہو کے روانہ ہو گئے۔

گومتی پار پہنچ کے گانا شروع ہوا۔ اس دن بیگا جان کا گانا۔

جھولا کن ڈارو رے امریاں

کیا کیا تانیں لی ہیں۔ دل پسا جاتا تھا۔

شہر سے نکل کے جنگل کا سماں قابل دید تھا۔ جدھر نگاہ جاتی ہے سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔ بادل چاروں طرف گھرے ہوئے ہیں۔ مینہ برس رہا ہے۔ درختوں کے پتوں سے پانی ٹپک رہا ہے۔ نالے، ندیاں، جھیلیں بھری ہوئی ہیں۔ مور ناچ رہے ہیں، کوئل کوک رہی ہے۔ بات کہتے میں تالاب پر پہنچ گئے۔ بارہ دری میں فرش کیا گیا۔ چولہے بن گئے، کڑھائیاں چڑھ گئیں۔ پوریاں تلی جانے لگیں۔ نواب چھٹن صاحب بارانی پہن کے شکار کو نکل گئے۔ گوہر مرزا آموں کی کھانچیاں چکالائے۔ اتنی دیر میں نوکروں نے سڑک کے کنارے باغ میں چھولداریاں گاڑ دیں۔ گاؤں سے چارپائیاں آگئیں۔ یہاں اور ہی لطف تھا۔ آم ٹپک رہے ہیں۔ ایک ایک آم پر چار چار آدمی ٹوٹے پڑتے ہیں۔ پانی میں چھپکے لگا رہے ہیں۔

کوئی ادھر دوڑا جا رہا ہے، کوئی ادھر۔ آپس میں دھینگا مشتی ہو رہی ہے۔ اب اس میں اگر کوئی گر پڑا تو کیچڑ میں لت پت، تھوڑی دیر میں پانی میں جا کے کھڑے ہو گئے۔ پھر ویسے ہی صاف۔ جن کے

مزاج میں کسی قدر احتیاط تھی، جیسے باجی بیگا جان، وہ چھولداری میں بیٹھیں رہیں۔

بسم اللہ نے پیچھے سے جا کے منہ پر آم کا رس مل دیا۔ پھر ان کی چیخیں اور سب کا قہقہہ لگانا، دیکھنے کا تماشا تھا۔

نہیں معلوم کہاں سے بہتی بہاتی تین ننھیاں آنکلیں۔ ان کو گوانا شروع کیا۔ ان کے ساتھ ڈھولکی والا غضب کی ڈھولکی بجاتا تھا۔ بھلا ان کا ناچ گانا ہم لوگوں کو کیا اچھا معلوم ہوتا۔ مگر اس موسم میں اور دیسی جگہ کچھ ایسا نامناسب نہ تھا۔ دو گھڑی دن رہے ہماری قسمت سے آسمان کھل گیا، دھوپ نکل آئی۔ ہم لوگ احتیاطاً ایک ایک جوڑا گھر سے لیتے آئے تھے۔ سب نے کپڑے بدلے۔ جنگل کی سیر کو نکلے۔

میں بھی اکیلی ایک طرف کو روانہ ہوئی۔ سامنے گنجان درخت تھے۔ سورج انہی گنجان درختوں کی آڑ میں ڈوب رہا تھا۔ سبزے پر سنہری کرنوں کے پڑنے سے عجب کیفیت تھی۔ جا بجا جنگلی پھول کھلے تھے۔ چڑیاں سبزے کی تلاش میں ادھر ادھر اڑ رہی تھیں۔ سامنے جھیل کے پانی پر آفتاب کی شعاع سے وہ عالم نظر آتا تھا جیسے پگھلا ہوا سونا تھلک رہا ہے۔ درختوں کے پتوں کی آڑ میں سورج کی کرنیں اور ہی عالم دکھا رہی تھیں۔ آسمان پر سرخ شفق پھولی ہوئی تھی۔ اس وقت کا سماں ایسا نہ تھا کہ خفقانی مزاج کی عورت، جیسی کہ میں ہوں، جلدی سے چھولداری میں چلی آتی۔ یہ تماشہ دیکھتی ہوئی خدا جانے کتنی دور نکل گئی۔ آگے جا کر ایک کچی سڑک ملی۔ اس پر کچھ گنوار راستہ چل رہے تھے۔ کسی کے کندھے پر ہل دھرا، کوئی بیلوں کو ہانکتا ہوا چلا آتا تھا۔ ایک چھوٹی سی لڑکی گائے بھینس لئے جاتی تھی۔ ایک لڑکا بہت سی بھیڑوں بکریوں کے پیچھے پیچھے تھا۔ یہ سب آنکھوں کے سامنے آئے اور پھر نظروں سے غائب ہو گئے۔ میں پھر اکیلی کی اکیلی ہی رہ گئی۔ نہیں معلوم کس دھن میں تھی۔ مگر اب اس سڑک پر چلنے لگی۔ اپنے نزدیک اب میں گویا تالاب کی طرف جا رہی ہوں۔ اب اندھیرا ہوتا جاتا ہے۔ سورج ڈوبنے ہی کو ہے۔ اب میرے قدم جلد جلد اٹھ رہے ہیں۔ آگے چل کر ایک فقیر کا تکیہ ملا۔ یہاں کچھ لوگ بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ یہاں میں نے تالاب کا راستہ پوچھا۔ معلوم ہوا کہ میں لکھنؤ کی طرف چلی جا رہی ہوں۔ تالاب دہنے کو چھوٹ گیا ہے۔ یہاں سڑک چھوڑنا پڑی۔ ایک بیہڑ میں سے ہو کے راستہ تھا۔ تھوڑی دور جا کر ایک نالہ ملا۔ نالے کے اس پار تھوڑے فاصلے پر دو تین درخت تھے۔ میں نے دیکھا کہ ان درختوں کی جڑ سے اک ذرا ہٹ کے کوئی شخص میلی سی دھوتی باندھے، مرزئی پہنے، ایک میلا سا چادرہ کمر سے لپٹا ہوا، کھرپی ہاتھ میں لئے کچھ کھود رہا ہے۔ میری اس

شخص کی آنکھیں چار ہوئیں۔ پہلے تو کچھ شبہ سا ہوا، پھر ایک مرتبہ غور سے دیکھا۔ اب قریب یقین کے ہو گیا کہ وہی ہے۔ چاہتی تھی کہ نظر پھیر لوں مگر نگاہ کم بخت اسی طرف لڑی رہی۔ اب تو بالکل یقین ہو گیا۔ قریب تھا کہ غش کھا کے گر پڑوں، اور ضرور ہی گر پڑتی، اتنے میں دور سے اکبر علی خاں کے نوکر سلار بخش کی آواز کان میں آئی۔ مجھے ڈھونڈنے نکلا تھا۔ مجھے دیکھ کر دلاور خان نے کھرپی ہاتھ سے رکھ دی تھی۔ جس طرح میں اسے دیکھ رہی تھی، وہ بھی مجھ کو دیکھ رہا تھا۔ مگر یقیناً مجھے اس نے نہ پہچانا ہو گا۔ میں نے اس کو اچھی طرح پہچان لیا تھا۔

سلار بخش کی آواز سن کر وہ نالے کی طرف بھاگا۔ اتنے میں سلار بخش میرے پاس پہنچ گیا۔ میں مارے خوف کے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ آواز منہ سے نہیں نکلتی تھی۔ گھگھی بندھی ہوئی تھی۔ سلار بخش نے میرا حال دیکھ کے کہا۔ "بائیں ڈر گئیں؟" میں نے درخت کی طرف اشارہ کیا۔ سلار بخش اس طرف دیکھنے لگا۔

سلار بخش:۔ وہاں کیا دھرا ہے۔ ایک کھرپی پڑی ہے۔ واہ! اس سے ڈر گئیں۔ آپ سمجھیں کوئی قبر کھود رہا تھا۔

(منہ سے تو نہ بولا گیا، میں نے ہاتھ سے نالے کی طرف اشارہ کیا)۔

سلار بخش:۔ چلم پینے گیا ہو گا تکئے پر۔ اچھا تو چلئے۔ نواب چھٹن صاحب بہت سی مرغابیاں شکار کر کے لائے ہیں۔ آپ کا کہیں پتہ نہیں۔ میاں ادھر ڈھونڈنے گئے ہیں، میں ادھر آیا۔ یہ کہئے آپ مل گئیں۔ نہیں تو آپ کو راستہ نہ ملتا۔ میں نے ہاں، نہ کسی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ آخر سلار بخش بھی چپ ہو رہا۔ تھوڑی دیر میں کھیتوں میں سے ہو کے تالاب پر پہنچ گئے۔

رات کو یہیں رہنے کی ٹھہری۔ جب کھانے وانے سے فراغت ہو گئی، میں نے اکبر علی خاں سے کل واقعہ بیان کیا۔

اکبر علی خاں:۔ تم نے اچھی طرح دیکھا۔ یہ وہی دلاور علی خاں تھا؟ فیض آباد کا رہنے والا؟ اس کا تو حلیہ جاری ہے۔ افسوس تم نے پہلے سے نہ کہا۔ بدمعاش کو چل کے گرفتار کرتے۔ بڑا نام ہوتا۔ سرکار سے انعام ملتا۔ ایک ہزار کا اشتہار ہے۔ اور یہ کھودتا کیا تھا؟

میں:۔ کیا معلوم، مردا اپنی قبر کھودتا ہو گا۔

اکبر علی خاں:۔ اس کے نام سے تمہارے منہ پر ہوائیاں چھوٹنے لگتی ہیں۔ اب وہ تمہارا کیا کر سکتا

ہے۔

میں:۔ (دل کو ذرا تھام کے) ضرور اس نے غدر کے زمانے میں کچھ وہاں گاڑ دیا ہو گا۔ اسے کھودنے آیا ہو گا۔

اکبر علی خاں:۔ چلو دیکھیں۔

میں:۔ میں تو نہ جاؤں گی۔

اکبر علی خاں:۔ میں جاتا ہوں۔ سلار بخش کو لئے جاتا ہوں۔

میں:۔ کہاں جاؤ گے؟ اب وہاں کچھ نہ ہو گا؟ وہ کھود کے لے بھی گیا ہو گا۔

اکبر علی خاں:۔ میں تو ضرور جاؤں گا۔

یہ ذرا زور سے کہا۔ پاس نواب چھٹن صاحب کی چھولداری تھی۔ وہ اور بسم اللہ دونوں جاگ رہے تھے۔

نواب:۔ خاں صاحب! کہاں جایئے گا؟

اکبر علی خاں:۔ نواب صاحب! ابھی آپ نے آرام نہیں کیا؟

نواب:۔ جی نہیں۔

اکبر علی خاں:۔ میں حاضر ہوں؟

نواب:۔ آیئے۔

اکبر علی خاں اور میں دونوں نواب کی چھولداری میں گئے۔ کل واقعہ بیان کیا۔

نواب:۔ (مجھ سے) اور تم اس بدمعاش کو کیا جانو؟

میں:۔ (اپنی سرگزشت تو ان سے کیا کہتی) میں جانتی ہوں اور اچھی طرح جانتی ہوں۔ میں بھی فیض آباد کی رہنے والی ہوں۔

نواب:۔ اخاہ! آپ بھی فیض آباد کی ہیں؟

اکبر علی خاں:۔ مگر اس مردود کا کوئی بندوبست کرنا چاہیئے۔ ایسے میں یہیں کہیں ہے۔ عجب نہیں گرفتار ہو جائے۔

یہ کہہ کر سلار بخش کو آواز دی، قلم دان منگوایا۔ تھانہ قریب تھا، تھانے دار کو رقعہ لکھا۔ تھوڑی دیر میں تھانے دار صاحب مع دس بارہ سپاہیوں کے آموجود ہوئے۔ میں نے جو دیکھا ان سے کہہ دیا۔ گاؤں سے پاسی بلوائے گئے۔ پہلے اس موقع پر جا کے ڈھونڈا۔ ٹیلے پر فقیر سے کسی قدر

سراغ ملا۔ ایک سپاہی کو ایک اشرفی شاہی زمانے کی ملی۔ وہ تھانے دار کے پاس لے آیا۔

تھانے دار:۔ خدا چاہے تو مع مال گرفتار ہو۔

تھانے دار صاحب نے واقعی اچھا بندوبست کیا۔ سپاہیوں نے خوب تگ و دو کی۔ آخر تین بجے رات کو مکا گنج میں گرفتار ہوا۔ صبح ہوتے ہوتے تلاب پر پہنچ گیا۔ تلاشی میں چوبیس اشرفیاں برآمد ہوئیں۔ میں شناخت کے لئے بلائی گئی۔ میری شناخت کے علاوہ دو سپاہیوں نے پہچانا۔ دس بجے چالان لکھنؤ روانہ ہو گیا۔

رسوا:۔ اچھا تو پھر اس کا حشر کیا ہوا۔ اس قصے کو جلدی ختم کیجئے۔

میں:۔ ہوا کیا۔ کوئی دو مہینے کے بعد معلوم ہوا پھانسی ہو گئی۔ واصلِ جہنم ہوا۔

اختتامیہ

نہ پوچھ نامہ اعمال کی دل آویزی
تمام عمر کا قصہ لکھا ہوا پایا

مرزا رسوا صاحب! جب آپ نے میری سوانح عمری کا مسودہ مجھے نظر ثانی کے لئے دیا تھا، مجھے ایسا غصہ آیا کہ جی چاہتا تھا پرزے پرزے کر کے پھینک دوں۔ بار بار خیال آتا کہ زندگی میں کیا کم روسیاہی ہوئی کہ اس کا افسانہ بعد مرنے کے بھی باقی رہے کہ لوگ اس کو پڑھیں اور مجھ کو لعنت ملامت کریں۔ مگر مزاج کی تساہلی اور آپ کی محنت کے لحاظ نے ہاتھ روک لیا۔

اتفاقاً کل شب کو بارہ بجے کے قریب سوتے سوتے آنکھ کھل گئی۔ میں حسب معمول کمرے میں تنہا تھی۔ مامائیں، خدمت گار سب نیچے کے مکان میں سو رہے تھے۔ میرے سرہانے لیمپ روشن تھا۔ پہلے تو بڑی دیر تک کروٹیں بدلا کی۔ چاہتی تھی سو جاؤں مگر کسی طرح نیند نہ آئی۔ آخر اٹھی، پان لگا کر کھایا۔ ماما کو پکارا، حقہ بھروایا، پھر پلنگ پر جا لیٹی۔ حقہ پینے لگی۔ جی میں آیا کوئی کتاب دیکھوں۔ بہت سے قصے کہانی کی کتابیں سرہانے الماری میں رکھی تھیں۔ ایک ایک کو اٹھا کے ورق الٹے پلٹے، مگر وہ سب کئی کئی مرتبہ کی دیکھی ہوئی تھیں۔ جی نہ لگا۔ بند کر کے رکھ دیں۔ آخر اسی مسودے پر ہاتھ پڑا۔ خفقان کی شدت تھی۔ سچ مچ میں نے اس کے چاک کرنے کا مصمم قصد کر لیا۔ چاک ہی کیا چاہتی تھی کہ یہ معلوم ہوا جیسے کان میں کوئی کہہ رہا ہے۔ "اچھا مراؤ بالفرض اسے تم نے پھاڑ کے پھینک دیا، جلا دیا، تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ تمام عمر کے واقعات، جو خدائے عادل و توانا کے حکم سے فرشتوں نے مفصل اور مشرح لکھے ہیں، انہیں کون مٹا سکتا ہے۔"

اس غیبی آواز سے میرے ہاتھ پاؤں لرزنے لگے۔ قریب تھا کہ مسودہ ہاتھ سے گر پڑے، مگر پھر میں نے اپنے تئیں سنبھالا۔ چاک کرنے کا خیال تو بالکل دل سے محو ہو گیا۔ جی چاہا جہاں سے اٹھایا تھا وہیں رکھ دوں۔ پھر ایک بار یوں ہی بلا قصد پڑھنا شروع کیا۔ پہلا صفحہ جب تمام ہو گیا ورق الٹا۔ دو چار سطریں اور پڑھیں۔ اس وقت مجھے اپنی سرگزشت سے کچھ ایسی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی کہ جس قدر پڑھتی جاتی تھی، جی چاہتا تھا اور پڑھوں۔ اور قصوں کو پڑھنے میں مجھے ایسا لطف کبھی نہ آیا تھا، کیوں کہ ان کے پڑھتے وقت یہ خیال پیش نظر رہتا تھا کہ یہ سب بنائی ہوئی باتیں ہیں، درحقیقت کوئی اصل

نہیں۔ یہی خیال قصے کو بے مزا کر دیتا تھا۔ میری سوانح عمری میں جو امور آپ نے قلم بند کئے ہیں، وہ سب مجھ پر گزرے ہیں۔ اس وقت وہ سب گویا میری آنکھوں کے سامنے تھے۔ ہر واقعہ اصلی حالت میں نظر آتا تھا اور اس سے طرح طرح کے اثر میرے دل و دماغ پر طاری ہوتے تھے، جس کا بیان بہت ہی دشوار ہے۔ اگر کوئی مجھے اس حالت میں دیکھتا تو اس کو میری دیوانگی میں کوئی شک نہ رہتا۔ کبھی تو میں بے اختیار ہنس پڑتی تھی۔ کبھی ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگتے تھے۔ غرضیکہ عجیب و غریب کیفیت تھی۔ آپ نے فرمایا تھا۔ "جا بجا بتاتی جانا۔" یہاں اس کا ہوش کسے تھا۔ پڑھتے پڑھتے صبح ہو گئی۔ اب میں اٹھی، وضو کیا، نماز پڑھی۔ پھر تھوڑی دیر سو رہی۔ صبح کو کوئی آٹھ بجے آنکھ کھلی۔ ہاتھ منہ دھو کے پڑھنے لگی۔ بارے سر شام تک سارا مسودہ پڑھ چکی۔

تمام قصے میں وہ تقریر آپ کی مجھے بہت ہی دلچسپ معلوم ہوئی جہاں آپ نے نیک بختوں اور خراب عورتوں کا مقابلہ کر کے ان کا فرق بتایا ہے۔ واقعی نیک بخت عورتوں کو جس قدر فخر ہو زیبا ہے، اور ہم ایسی بازاریوں کو ان کے اس فخر پر بہت ہی رشک کرنا چاہیئے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ خیال آیا کہ اس باب میں بخت و اتفاق کو بہت کچھ دخل ہے۔ میری خرابی کا سبب وہی دلاور خاں کی شرارت تھی۔ نہ وہ مجھے اٹھا لاتا اور نہ اتفاق سے خانم کے ہاتھ فروخت ہوتی، نہ میرا یہ لکھا پورا ہوتا۔ جن امور کی برائی میں اب مجھے کوئی شبہ نہیں رہا اور اسی لئے ایک مدت ہوئی کہ میں ان سے بیزار اور تائب ہوں، اس زمانے میں ان کی حقیقت مجھے کسی طرح نہیں معلوم ہو سکتی تھی۔ نہ ایسا کوئی قانون مجھے بتایا گیا تھا کہ میں ان سے اجتناب کرتی، اور اگر ایسا نہ کرتی تو مجھے سزا دی جاتی۔ میں خانم کو اپنا مالک اور حاکم تصور کرتی تھی، ان سے بہت ڈرتی تھی اور حتی الامکان ایسا کوئی کام نہ کرتی تھی جو ان کی مرضی کے خلاف ہو۔ اور اگر کرتی بھی تو بہت چھپا کے، تاکہ ان کی مار اور جھڑکیوں سے بچ سکوں۔ اگرچہ خانم نے مجھے زندگی بھر پھول کی چھڑی بھی نہیں چھوائی، مگر خوف غالب تھا۔

جن لوگوں میں میں نے پرورش پائی تھی، جو ان کا طریقہ تھا وہی میرا بھی تھا۔ میں نے اس زمانے میں کبھی کسی مذہبی عقیدے پر غور نہیں کیا اور میرا خیال ہے کوئی ایسی حالت میں نہ کرتا۔

ارضی و سماوی حادثے جن کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے، مگر جب واقع ہوتے ہیں تو دلوں میں ایک خاص قسم کی دہشت سما جاتی ہے۔ مثلاً زور سے بادل کا گرجنا، بجلی کا چمکنا، آندھیوں کا آنا، اولوں کا گرنا یا زلزلے کا آنا، سورج گہن یا چاند گہن، قحط سالی، وبا وغیرہ ایسے امور اکثر خدائی غضب کی علامتیں سمجھی جاتی تھیں۔ پھر میں نے دیکھا کہ لوگوں کے بعض اعمالوں کی وجہ سے وہ رفع دفع ہو گئیں، مگر یہ بھی دیکھا کہ بہت سی آفتیں دعا، تعویذ، ٹوٹکے کسی بات سے نہ ٹلیں۔ ایسے امور کو لوگ خدا کی

مرضی، تقدیر آسمانی کی طرف منسوب کر دیا کرتے ہیں۔ مذہبی احکام مجھ کو مفصل نہ پہنچے تھے اور نہ ثواب عذاب کا مسئلہ اچھی طرح سمجھایا گیا تھا۔ اس لئے ان باتوں کا اثر میرے دل پر نہ تھا۔ بے شک اس زمانے میں میرا کوئی مذہب نہ تھا۔ صرف جو اور لوگوں کو کرتے دیکھتی تھی وہی آپ بھی کرنے لگتی تھی۔ اس وقت میں میرا کوئی مذہب ہی نہ تھا۔ تقدیر پر میں بہت ہی شاکر تھی۔ جو کام میں کاہلی سے نہ کر سکتی تھی یا میری بے وقوفی سے بگڑ جاتا تھا اس کو تقدیر کے حوالے کر دیتی۔ فارسی کتابوں کے پڑھنے سے آسمان کی شکایت کرنے کا مضمون میرے ہاتھ آگیا تھا۔ جب میرا کوئی مطلب فوت ہو جاتا تھا یا کسی اور وجہ سے مجھے ملال پہنچتا تھا تو جا و بے جا فلک کی شکایتیں کیا کرتی تھی۔

ہم بھی ہیں مختار لیکن اس قدر ہے اختیار
جب ہوئے مجبور قسمت کو برا کہنے لگے

مولوی صاحب، بوا حسینی اور بڈھے بڑھیاں جب اگلے زمانے کی باتیں کرتے تھے تو اس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس زمانے سے بہت ہی اچھا تھا۔ اس لئے ان کی طرح میں بھی اس زمانے کی غائبانہ تعریف اور زمانہ موجودہ کی بلا وجہ مذمت کیا کرتی تھی۔ میں کم بخت اس بات کو نہ سمجھی کہ بڈھے بڑھیاں، جو اگلے وقتوں کی تعریف کرتے ہیں، اس کا سبب یہ ہے کہ اپنی اپنی جوانی کے دن سب کو بھلے معلوم ہوتے ہیں، اس لئے دنیا بھلی معلوم ہوتی ہے۔ خود زندہ جہان زندہ۔ خود مردہ جہان مردہ۔ سن رسیدہ لوگوں کے دیکھا دیکھی جوانوں نے بھی انہی کا وطیرہ اختیار کر لیا ہے اور چونکہ یہ غلط فہمی ایک مدت سے چلی آتی ہے اس لئے اب عموماً سب کو اس کی عادت سی ہو گئی ہے۔

جوان ہونے کے بعد میں عیش و آرام میں پڑ گئی تھی۔ اس زمانے میں گا بجا کے مردوں کو رجھانا میرا خاص پیشہ تھا۔ اس میں بہ مقابلہ اور ساتھ والیوں کے جس قدر کامیابی یا ناکامی مجھ کو ہوتی تھی، وہی میری خوشی اور رنج کا اندازہ تھا۔ میری صورت بہ نسبت اوروں کے کچھ اچھی نہ تھی، مگر فن موسیقی کی مہارت اور شعر و سخن کی قابلیت کی وجہ سے میں سب سے بڑھی چڑھی رہی۔ اپنی ہم پیشہ عورتوں میں مجھے ایک خاص امتیاز حاصل تھا۔ مگر اس سے کچھ نقصان بھی ہوا۔ وہ یہ کہ جس قدر میری عزت زیادہ ہوتی گئی، اتنا ہی خود داری کا خیال دل میں پیدا ہوتا گیا۔ جہاں اور رنڈیاں بے باکیوں سے اپنا مطلب نکال لیتی تھیں، میں منہ دیکھتی رہ جاتی تھی۔ مثلاً ان کا یہ عام قاعدہ تھا کہ ہر کس و ناکس سے کسی نہ کسی قسم کی فرمائش ضرور کر دینی چاہیئے۔ مجھے اس سے شرم آتی تھی۔ یہ خیال آتا تھا کہ ایسا نہ ہو انکار کر دے تو خفت ہو گی۔ اور نہ ہر شخص سے میں بہت جلد بے تکلف ہو جاتی تھی۔ میری اور ساتھ والیوں کے پاس جب کوئی آکے بیٹھتا تو ان سب کو زیادہ فکر اس کی ہوتی کہ یہ کہاں تک دے

سکتا ہے اور ہم کہاں تک اس سے لے سکتے ہیں۔ میرا بہت سا وقت اس شخص کی ذاتی لیاقت، حسن اخلاق کے اندازہ کرنے میں صرف ہو جاتا تھا۔ مانگنے کی عادت کو میں معیوب سمجھنے لگی تھی۔ اس کے علاوہ اور باتیں بھی مجھ میں رنڈی پنے کی نہ تھیں۔ اس لئے میری ساتھ والیوں میں سے کوئی مجھے ناک چوٹی گرفتار، کوئی خفقانی، کوئی بیوقوف، کوئی دیوانی سمجھتی تھی۔ مگر میں نے اپنی کی، کسی کی نہ سنی۔

پھر وہ زمانہ آیا کہ میں رنڈی کے ذلیل پیشے کو عیب سمجھنے لگی اور اس سے دست بردار ہو گئی۔ ہر کس و ناکس سے ملنا چھوڑ دیا۔ صرف ناچ مجرے پر بسر اوقات رہ گئی۔ یا کسی رئیس نے نوکر رکھا تو نوکری کر لی، رفتہ رفتہ یہ بھی ترک کر دیا۔

جب ان افعال سے تائب ہوئی جن کو میں نے اپنے نزدیک برا سمجھ لیا تھا تو اکثر میرے جی میں آیا کہ کسی مرد آدمی کے گھر پڑ جاؤں۔ لیکن پھر یہ خیال آیا کہ لوگ کہیں گے "آخر رنڈی تھی نا، کفن کا چونگا کیا۔" مرزا صاحب! شاید اس محاورے کو آپ نہ سمجھیں۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ جب کوئی رنڈی سن سے اتر کر کسی کے گھر بیٹھ جاتی ہے تو تجربہ کار تماش بین اس کی نسبت کہا کرتے ہیں کہ اس رنڈی نے "کفن کا چونگا کیا" یا "مرتے مرتے کفن لے مری۔" یعنی اپنے دام بچا لئے اور از راہ فریب تماش بین پر اپنی تجہیز و تکفین کا بار ڈالا۔ اس مثل سے رنڈیوں کی بے حد خود غرضی اور لالچ اور فریب کا ثبوت ملتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہم لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ میں سچ مچ تائب ہو گئی اور اب انتہا کی نیک ہوں، مگر اس کو سوائے خدا کے اور کون جانتا ہے۔ کسی شخص کو میری نیکی کا یقین نہیں ہو سکتا۔ پھر اگر اس حالت میں کسی کی محبت کروں اور اس محبت کی بنا سراسر خلوص اور نیک نیتی پر ہو، اس پر بھی خاص وہ شخص اور اس کے سوا جو لوگ دیکھیں یا سنیں گے، کبھی یقین نہ لائیں گے۔ پھر میرا محبت کرنا ہی بے سود ہو گا۔ لوگ مشہور کرتے ہیں کہ میرے پاس دولت ہے، اس لئے اکثر لوگ اس سن میں بھی میری خواہش کرتے ہیں اور طرح طرح کے فریب مجھ کو دینا چاہتے ہیں۔ کوئی صاحب میرے حسن و جمال کی تعریف کرتے ہیں اگرچہ ان کا تعلق میں ایسی رنڈیوں سے سن چکی ہوں جو بہ درجہا مجھ سے بہتر ہیں۔ کوئی صاحب میرے کمال موسیقی پر غش ہیں، حالانکہ ان کے کان تال سم سے آشنا نہیں۔ کوئی میری شاعری کے مداح ہیں، جنہوں نے عمر بھر ایک مصرع موزوں کہنا تو کیسا، پڑھا بھی نہ ہو گا۔ ایک صاحب میری علمیت کے قائل ہیں۔ خود بھی پڑھے لکھے ہیں، مگر مجھ کو "مولانا بالفضل اولانا" سمجھتے ہیں۔ معمولی مسئلے روزہ نماز کے بھی مجھ ہی سے پوچھ لیا کرتے ہیں۔ گویا کہ آپ میرے مرید یا متلمذ ہیں۔ ایک

میرے عاشق زاد میری دولت اور کمال سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے، صرف میری تندرستی کے خواہاں ہیں۔ ہر بات پر اللہ آمین، مجھے چھینک آئی اور ان کے سر میں درد ہونے لگا۔ مجھے درد سر ہوا اور ان کے دشمنوں کا دم نکلنے لگا۔ ایک بزرگ ناصح مشفق بنے ہیں۔ دنیا کے نشیب و فراز سمجھایا کرتے ہیں۔ مجھ کو بہت ہی بھولا سمجھتے ہیں۔ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں جیسے کوئی دس گیارہ برس کی لڑکی سے باتیں کرتا ہو۔

میں ایک گھاگ عورت ہوں، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے۔ جو جس طرح بناتا ہے بن جاتی ہوں اور درحقیقت ان کو بناتی ہوں۔ خلوص کے ساتھ بھی ملنے والے دو ایک صاحب ہیں۔ بے غرض ملتے ہیں۔ ان کا مقصود صرف ایک مذاق خاص ہے۔ مثلاً شعر و سخن یا گانا بجانا یا صرف لطف گفتگو۔ نہ ان کو کوئی غرض مجھ سے ہے، نہ مجھے کوئی غرض ان سے ہے۔ ایسے لوگوں کو دل سے چاہتی ہوں اور یہ بے غرضی رفتہ رفتہ ایک غرض ہو گئی ہے کہ نہ مجھے بغیر ان کے چین آتا ہے اور نہ انہیں بغیر میرے۔ مگر ان لوگوں میں سے کوئی میرے گھر میں بٹھانے کا امیدوار نہیں ہے۔ کاش کہ ایسا ہوتا۔ مگر یہ تمنا ایسی ہی ہے جیسے کوئی کہے کاش کہ جوانی پھر آتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت کی زندگی جوانی تک ہے۔ اگر جوانی کے ساتھ ہی زندگی ختم ہو جایا کرتی تو کیا خوب ہوتا۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ یوں تو بڑھاپا ہر ایک کے لئے برا ہے، خصوصاً عورت کے لئے، مگر رنڈی کے لئے بڑھاپا دوزخ کا نمونہ ہے۔ بڑھیا فقیرنیاں جو لکھنؤ کے گلی کوچوں میں پڑی پھرتی ہیں، اگر غور کیجئے گا تو ان میں اکثر رنڈیاں نکلیں گی، اور رنڈیاں بھی کون سی جو کبھی زمین پر پیر نہ رکھتی تھیں۔ قیامت برپا کر رکھی تھی۔ ہزاروں بھرے پرے گھر تباہ کر دیئے، سینکڑوں جوانوں کو بے گناہ قتل کیا۔ جہاں جاتی تھیں لوگ آنکھیں بچھاتے تھے۔ اب کوئی ان کو آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتا۔ پہلے جہاں بیٹھ جاتی تھیں لوگ باغ باغ ہو جاتے تھے۔ اب کوئی کھڑے ہونے کا روادار بھی نہیں۔ پہلے بن مانگے موتی ملتے تھے، اب مانگے بھیک نہیں ملتی۔

ان میں اکثر اپنے ہاتھوں اپنی تباہی کا باعث ہوئیں۔ ایک بڑی بی میرے مکان پر کبھی کبھی آیا کرتی تھیں۔ کسی زمانے میں بڑی مشہور رنڈیوں میں تھیں۔ جوانی میں ہزاروں روپے کمائے۔ ذرا مزے دار جیوڑا تھا۔ جب سن سے اتریں، وہی کمائی یاروں کو کھلانا شروع کی۔ بڑھاپے میں ایک نوجوان کے گھر بیٹھیں۔ اس کی جورو خوبصورت، کم سن، بھلا وہ ان پر کیوں ریجھتا۔ پہلے تو بیوی ذرا بگڑیں، مگر جب میاں نے اصل مطلب سمجھا دیا، خاموش ہو رہیں۔ ان کی خاطریں ہونے لگیں۔ جب تک مال رہا خوب میاں بیوی دونوں نے پھسلا پھسلا کے کھایا آخر کھکھ ہو گئیں۔ اب کون پوچھتا

تھا۔ نکال باہر کیا۔ گلیوں کی ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہیں۔

بعض بے وقوف رنڈیوں نے کسی لڑکی کو لے کے پالا۔ اس سے دل لگایا۔ اس حماقت میں میں بھی گرفتار ہو چکی ہوں۔ مگر جب وہ جوان ہوئی، لے دے کے کسی کے ساتھ نکل گئی۔ یا اگر رہی تو کل مال رفتہ رفتہ اپنے قبضے کیا۔ ان کو گھر کا انتظام یا ملا گیری کرنے کو رکھ لیا۔

آبادی نے بھی مجھے جل دیا ہوتا، مگر وہ تو کہو اس کے کرتوت پہلے ہی کھل گئے، نہیں تو مجھے لوٹ ہی لے جاتی۔ مرد کیا اور عورت کیا، رنڈی کی قوم میں بدکاروں کی زندگی کا اصول ہی ایسا بگڑا بنا ہوا ہے کہ ایک دوسرے میں محبت نہیں ہو سکتی۔ نہ کوئی سمجھ دار مرد ہی ان کو دل دے سکتا ہے، کیوں کہ سب جانتے ہیں کہ رنڈی کسی کی نہیں ہوتی اور نہ ہی عورت ایسی محبت کر سکتی ہے۔ نوچیاں اپنے دل میں یہ سمجھتی ہیں کہ جاتے ہم ہیں، پھر ان کو کیوں دیں۔

اگلے قدردان مرد زوال حسن کے بعد کنارا کرتے ہیں۔ یہ اس کی عادی ہوتی ہیں کہ لوگ جھوٹی خوشامد کریں۔ بھلا اب کوئی خوشامد کیوں کرنے لگا۔ غرض کہ مرد ان سے کنارا کش اور یہ مردوں کی شاکی رہتی ہیں۔

پہلے پہلے میں بھی اور رنڈیوں کی زبانی مردوں کی بے وفائی کا دکھڑا سن کے وقت ضائع کرتی تھی اور بے سمجھے ان کی ہاں میں ہاں ملا دیتی تھی، مگر باوجود اس کے کہ گوہر مرزا نے میرے ساتھ جو سلوک کیا وہ سب آپ کو معلوم ہے، اور نواب صاحب جنہوں نے مجھ پر نکاح کا الزام لگایا تھا، اس کو بھی آپ سن چکے، پھر بھی میں مردوں کو بے وفا نہیں کہہ سکتی۔ اس معاملے میں عورتیں، خصوصاً بازار والیاں، ان سے کسی طرح کم نہیں۔ محبت کے باب میں مرد (معاف کیجئے) اکثر بے وقوف اور عورتیں بہت ہی چالاک ہوتی ہیں۔ اکثر مرد سچے دل سے اظہار عشق کرتے ہیں اور اکثر عورتیں جھوٹی محبت جتاتی ہیں۔ اس لئے کہ مرد جس حالت میں اظہار تعشق کرتے ہیں وہ حالت ان کی اضطراری ہوتی ہے، اور عورتیں بہت جلد متاثر نہیں ہوتیں، کیوں کہ مرد بہت ہی جلد عورتوں کے حسن ظاہری پر فریفتہ ہو کر ان پر شیدا ہو جاتا ہے اور عورتیں اس باب میں زیادہ احتیاط کرتی ہیں۔ اسی لئے مردوں کی محبت کسی قدر سریع الزوال اور عورتوں کی محبت عسیر الزوال ہوتی ہے۔ مگر جانبین کے حسن معاشرت سے ان امور میں ایک خاص قسم کا اعتدال پیدا ہو سکتا ہے، بشرطیکہ دونوں، یا کم از کم ایک، کو سمجھ ہو۔ واقعی مرد اس باب میں سریع الاعتقاد ہوتے ہیں اور عورتیں انتہا کی شکی۔ مرد پر عورت کا جادو بہت جلد چل جاتا ہے مگر عورت پر حسب کا عمل مشکل سے کارگر ہوتا ہے۔ میرے نزدیک یہ نقص فطرت کی طرف سے ہے، اس لئے کہ عورتیں ضعیف القویٰ ہیں اس لئے ان کو بعض وصف

ایسے دیئے گئے ہیں جن سے یہ کمی پوری ہو جائے۔ من جملہ ان اوصاف کے ایک وصف یہ بھی ہے، بلکہ میں کہہ سکتی ہوں شاید یہی ایک وصف ہے اس کی مثال جانوروں میں بھی مل سکتی ہے۔ اکثر ضعیف جانوروں میں بھی حیلہ گری کا مادہ ہے۔

اکثر مرد یہ کہیں گے کہ عورتیں حسین ہوتی ہیں۔ میں اس کی قائل نہیں۔ درحقیقت نہ مرد ہی بجائے خود حسین ہے نہ عورت، بلکہ ہر ایک کو ایسا حسن عنایت ہوا ہے، جو دوسرے کو اچھا معلوم ہو۔ یوں تو مرد عورت جس کا ناک نقشہ اچھا ہوتا ہے، سب اسے پسند کرتے ہیں، مگر اصل قدردان مرد کے حسن کی عورت اور عورت کے حسن کا مرد ہے۔ ایک خوبصورت عورت دوسری عورت کے سامنے اس خوش رنگ پھول سے زیادہ نہیں ہے جس میں خوشبو نہ ہو، ایک بدصورت مرد بھی، خوبصورت سے خوبصورت عورت کی رائے میں خوشبو دار پھول کی طرح دل پسند ہے، اگرچہ اس کی شکل اور رنگت میں کوئی ندرت نہ ہو۔ محبت کے باب میں غلطی صرف ایک ہی طرف سے نہیں ہوتی، بلکہ دونوں اس باریکی کو نہیں سمجھتے۔ ان دونوں محبتوں کی اصلیت میں فرق ہے۔ جس نگاہ سے مرد عورتوں کو دیکھتے ہیں، اس نگاہ سے عورت مرد کو دیکھتی ہی نہیں۔ عورتوں کی محبت کرنے کا اندازہ اس مرد میں ایک حد تک پایا جاتا ہے، جو کسی مالدار عورت کے دامن دولت سے وابستہ ہے، یا جس کا سن بہت کم ہے۔ مگر کوئی سن رسیدہ عورت ان کو کیوں چاہنے لگی؟

اس میں شک نہیں کہ عورتیں جوان مرد سے بہ نسبت بڈھوں کے زیادہ محبت رکھتی ہیں، مگر اس کی وجہ بھی محض حسن و جمال نہیں ہے، بلکہ وجہ یہ ہے کہ عورت ضعیف القویٰ ہے، اس لئے وہ ہر حالت میں اپنے حمایتی کو بہت دوست رکھتی ہے تاکہ وقت ضرورت اس کو خطرے سے بچا سکے۔ پس جوان سے بہ نسبت بڈھے کے اس کی زیادہ توقع ہو سکتی ہے، اور حسن و جمال اس خوبی کے ساتھ مل کر اس کے وصف کو رونق دے دیتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مرد کی محبت میں صرف لذت حاصل کرنا مقصود ہے اور عورت کی محبت میں الم سے محفوظ رہنا اور لذت حاصل کرنا دونوں غرضیں شامل ہیں۔

چونکہ یہ مشہور ہے کہ محبت بے غرض ہونا چاہئے اور عورت کی محبت میں اس کا زیادہ لگاؤ ہے، لہذا وہ اس کے چھپانے کی کوشش کرتی ہے۔ شاید کوئی یہ کہے کہ جو امور میں نے اس موقع پر بیان کئے ہیں اس میں اکثر باتوں کا امتیاز نہ مردوں کو ہوتا ہے، نہ عورتوں کو، تو میں اسے تسلیم کر لوں گی اور یہ کہوں گی کہ یہ باتیں اصل فطرت سے مرد عورت کے خمیر میں داخل ہیں۔ ضروری نہیں ہے کہ انہیں اس کا شعور بھی ہو۔ میں نے عمر بھر کے تجربے کے بعد یہ امور دریافت کئے ہیں اور